''اوراقِ ہستی'': ایک مطالعہ

رضوان اللہ صاحب کی تحریروں سے میری شناسائی تقریبا دوعشروں پر محیط ہے۔ ''اوراقِ ہستی'' دراصل ان کی خودنوشت سوانح ہے، جو ان کے تخلیق آشنا ذہن کی حقیقی تعبیر ہے۔ جس میں ان کا تخلیقی کمال اپنی متنوع جہات سے روشنی بکھیر رہا ہے۔ اسے آپ بیتی، شہر بیتی اور سماج بیتی کا مثلث بھی کہا جا سکتا ہے۔

خودنوشت کا چلن اگر چہ کمیاب ہوتا جا رہا ہے مگر اس کی اہمیت سے انکار مشکل ہے۔ یہ صنف اپنے عہد کی تاریخی، تہذیبی، سماجی و سیاسی حالات کا آئینہ دار ہوتی ہے۔ ایک ماہر خودنوشت نگار کے فن پارے سے جہاں ہم اس کے حالات زندگی کا مشاہدہ کرتے ہیں، وہیں اس کے عہد کے رسم و رواج، طرز معاشرت، سیاسی و سماجی حالات اور تہذیبی و تعلیمی کیفیت سے بھی بھرپور آگہی حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ سبھی باتیں ہمیں ''اوراقِ ہستی'' میں پورے طور پر ملتی ہیں۔

رضوان اللہ صاحب کی تحریروں میں اتنا تنوع ہے کہ قاری کبھی بھی اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا، بلکہ صفحہ بہ صفحہ مزید تازگی، فرحت اور توانائی کشید کرتا رہتا ہے۔ مصنف نے ''اوراقِ ہستی'' میں مختلف مقامات کے تخلیقی شعور کو عبارات و اشارات میں سمیٹ کر کو لاژ کی شکل دے دی ہے، جس میں فکر کی بلندی ہے، طنز کے تیر ہیں اور مزاح کی شگفتگی بھی ہے۔

مصنف ایک منجھے ہوئے صحافی ہیں، ان کی روانی تحریر کا کیا کہنا، وہ کہتے ہیں نا 'ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، پڑھے لکھے کو فارسی کیا' آیئے انہی کی تحریروں سے انھیں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، اپنی کتاب کا آغاز ہی کچھ اس انداز سے کرتے ہیں کہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے،——

''نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم، لیکن 'حکایت ہستی' جو درمیاں سے سنی، وہ کچھ اس طرح ہے کہ ضلع اعظم گڑھ (یوپی) کے ایک دور افتادہ گاؤں سمبھی میں جہاں میرا ننہال تھا، میں نے حیرت کدۂ عالم پر پہلی نظر ڈالی۔ وہ ۱۹۳۰ء کے آس پاس کوئی تاریخ تھی، لیکن جب

اسکول میں داخلہ ہوا تو میری تاریخ پیدائش ۱۵؍جولائی ۱۹۳۱ء درج کرائی گئی، چنانچہ مستند تاریخ وہی ہے۔'' —— میری عمر کے پہلے سال کے بارہ مہینے بھی نہیں پورے ہوئے تھے کہ میری ماں نے اس شیر خوار کو اپنی ماں کے آنچل میں ڈال کر رحلت فرمائی، ایک ناعاقبت اندیش سانپ اس کا موجب ہوا —— قرآن اور اردو کی ابتدائی تعلیم گھر ہی میں ہوئی لیکن اس کی ابتدا سے پہلے ہی میں دیگر مشاغل شروع کر چکا تھا —— پاؤں نکالے تو گھر کی چہار دیواری کے باہر کھیت، کھلیان، پیڑ پودے، باغات، میدان اور پوکھرے، تالاب میری جولانگاہ تھے —— بڑوں کی ساری توجہات کے باوجود میں اپنے پسندیدہ مشاغل کے لیے راہیں تلاش کر لیتا اور اس میں نہ گرمیوں کی تپش، نہ جاڑوں کی ٹھار حائل ہوتی۔ رفتہ رفتہ پیڑ پر چڑھنے کا فن بھی سیکھ ہی نہیں لیا بلکہ اس میں خاصی مہارت حاصل کر لی۔ تاڑ کے علاوہ کوئی درخت خواہ کتنا ہی دشوار گزار کیوں نہ ہو میری دسترس سے نہیں بچ سکتا تھا۔ آگے چل کر مچھلی اور چڑیوں کا شکار لڑکپن کے مشاغل میں شامل ہو گیا۔ غلیل، کمپا، مچھلی پکڑنے کے لگے کانٹے وغیرہ میری دلچسپیوں کے سامان ہو گئے۔ اپنی ان مصروفیات کو جاری رکھنے کے لیے مجھے چھری، چاقو، ہولڈر کی نب جیسی چیزوں کی ضرورت ہوا کرتی۔ جب باورچی خانے سے چھری یا قلمدان کے ہولڈر سے نب غائب ہوتی تو سب سے پہلے اس کی پرسش مجھ سے ہی ہوا کرتی —— تین ہم جولیوں یعنی میرے سمیت چار کی ایک ٹولی تھی۔ جو دھول، کیچڑ، پانی، کھیت کھلیان، باغ اور ویرانے میں بیک جان چہار قالب موجود رہتی —— کسب ہماری جبلت تھی، اس لیے فصل کے مطابق آم، جامن، امرود، انار، بیر گولر وغیرہ پھل جب اور جہاں دستیاب ہوتے حسب توفیق بدست خود دہان خود کے اصول پر عمل کرتے —— میری نانی نے جو بیوہ تھیں میری ماں کے آخری لمحات میں اس سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ جس شیر خوار کو چھوڑے جا رہی ہیں اسے وہ اپنے گلے کا تعویذ بنا کر رکھیں گی، اسی تعویذ کی برکت تھی کہ میں بالکل آزاد تھا —— میرے شعور نے ابھی پوری طرح آنکھ بھی نہیں کھولی تھی کہ ایک دن ان بزرگہ کو نہ معلوم کیا سوجھی کہ وہ اپنے وعدے سے پھر گئیں اور اس تعویذ کو نوچ پھینکا —— جولائی کی ابتدائی تاریخیں رہی ہوں گی، سال

۱۹۳۷ء رہا ہوگا، میرے ماموں مولوی حفیظ الرحمٰن صاحب ایمن شہابی گرمی کی چھٹیاں گزار کر کانپور واپس جا رہے تھے۔ وہ میری نانی کے اکلوتے بیٹے تھے، کانپور میں اسکول ٹیچر تھے، نانی نے مجھے ان کی تحویل میں دے دیا——اعظم گڑھ سے کانپور کا فاصلہ تب بھی دس گھنٹے کا تھا اب بھی دس گھنٹے کا ہے——اعظم گڑھ اور شاہ گنج کے درمیان تو خیر چھوٹی لائن تھی۔ شاہ گنج میں جب ہم لوگ دہر دون ایکسپریس میں سوار ہوئے تو وہ چند بوگیوں پر مشتمل نفیس ٹرین تھی اور مسافروں کا یہ عالم تھا کہ ٹرین چھوٹنے کے بعد ماموں جان نے اپنی شیروانی کو سیٹ پر بچھایا اور مجھے یہ ہدایت کر کے تم نہ سونا، خود سو گئے۔ ہم سوتے بھی کیسے، ہمارے لیے تو سب کچھ نیا تھا، ان کو دیکھنا بھی تھا۔ تیز رفتار ریل گاڑی کے قریب کی زمین کو اتنی ہی تیز رفتاری سے پیچھے بھاگتے اور دور کی آبادیوں، پیڑ پودوں کو نسبتاً کم رفتار سے ٹرین کی سمت میں چلتے رہنے کا حیرت انگیز مشاہدہ پہلی بار ہوا تھا۔'' (ص-۱۹ تا ۲۵)

رضوان اللہ صاحب نے اپنی زندگی کے مختلف نشیب و فراز کو بڑے صبر و استقامت سے جینے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے، معاشی تنگی کے باعث تعلیمی سرگرمیوں کو قسطوں میں مکمل کیا اور لمحات زیست کی مختلف ناخوشگواریوں کو بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور اسے اپنی شگفتہ تحریروں میں سمو کر قارئین کے لیے بھی دلبستگی کا سامان میسر کیا ہے۔

موصوف عہد طفولیت کی مختلف سرگرمیوں مثلاً چڑیوں کا شکار، کبڈی، فٹبال، گلی ڈنڈا، تیراکی، درختوں پر چڑھنا، کشتی رانی، سائیکل سواری، تاش، شطرنج، فلم بینی وغیرہ وغیرہ کے علاوہ عملی میدان میں بھی ہر فن مولی رہے ہیں۔ پھلوں کی تجارت کی، کلرکی سے وابستہ رہے، ریلوے کی مشقت طلب ملازمتیں کیں، کچہری میں نقل نویسی کا عمل انجام دیا، پی آر ڈی کے انچارج رہے اور آخر میں صحافت کے پیشے کو اعجاز بخشا اور اپنے عمل پیہم اور آہنی عزم کی بدولت ایام حیات کی مشقتوں اور پریشانیوں کو بالآخر مات دے کر آرام و سکون کے خوشگوار لمحات بھی حاصل کیے، لندن و امریکہ گئے اور بڑے بڑے ہوٹلوں میں قیام بھی کیا۔

رضوان اللہ صاحب کی کتاب حیات تقریباً نو دہائیوں کو محیط ہے مگر ان کے تجربات و مشاہدات کا دائرہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے، وہ اپنی زندگی سے جڑے واقعات کو بڑے

دلکش انداز میں ایجاز واختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔وہ اپنی دادی کی بزرگی اورخرق عادت باتوں کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک بار نانی بہت پریشان تھیں کہ کانپور سے بہت دنوں سے حفیظ الرحمٰن (میرے ماموں جان) کا خط نہیں آیا ہے۔دادی حسب معمول کمرے سے باہر آئیں تو نانی نے ان سے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔دونوں سمدھنیں ایک دوسرے کو 'بہن' کہہ کر مخاطب کرتیں۔نانی کی باتیں سنتے ہی دادی دوزانوں بیٹھ گئیں،سر پر لپٹا ہوا دوپٹہ ذرا سا منے کو کھینچ لیا، پھر ان کی آواز بدل گئی اور یوں بولتی چلی گئیں جیسے کوئی رننگ کمنٹری دے رہا ہو۔''ڈاکٹر آیا ہے،کلائی میں زخم معلوم ہوتا ہے، پٹی لپیٹی جارہی ہے۔' وغیرہ وغیرہ۔چند دنوں بعد ماموں جان کا خط آیا، واقعی ان کی کلائی میں پھوڑا نکل آیا تھا، دادی کی اس کیفیت کی کوئی تاویل یا تشریح نہیں کی جاسکتی۔''(ص-۴۷)

موصوف ایک جگہ 'کوئر یا پار' کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''محترم خلیل الرحمٰن بھائی (شمس الرحمٰن فاروقی کے والد) نے اپنی تصنیف ''قصص الجمیل فی سوانح خلیل'' میں لکھا ہے کہ گاؤں کی شمال مشرقی حدوں کے قریب ایک تالاب ہے اس کے پوربی کنارے پر زمانۂ قدیم کا ایک مزار ہے جو لکھوری اینٹوں کا ہے.....وہ مزار ایک بزرگ کوڑیا شاہ کا ہے، انہی کی نسبت سے اس گاؤں کا نام 'کوڑیا پار' ہوا۔عین ممکن ہے کہ اس علاقے میں وارد ہونے والے اولین بزرگوں میں وہ شامل رہے ہوں۔'' (ص-۴۹)

رضوان اللہ صاحب ایک کہنہ مشق صحافی، ماہر مترجم، طنز ومزاح نگار اور منجھے ہوئے شاعر ہیں، انھیں اردو، فارسی اور انگریزی پر یکساں مہارت ہے۔ان کی اردو، فارسی اور انگریزی کی تحریروں کو پڑھ کر اندازہ لگانا مشکل ہوگا کہ وہ کس زبان میں زیادہ کمال رکھتے ہیں۔راقم الحروف نے اپنی زندگی میں جن باکمال شخصیات کا مشاہدہ کیا ہے، رضوان اللہ صاحب بلاشبہ ان میں سے ایک ہیں۔موصوف کی تحریروں میں جابجا شوخی ومزاح کا رنگ جھلکتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''یہاں ضمناً یہ بیان کر دینے میں کچھ مضائقہ نہ ہوگا کہ ہمارے درختوں پر جو آم نونیوں کی دسترس سے باہر ہوتے وہ میری دسترس سے نہیں بچ سکتے تھے، اس سے پیڑ پر چڑھنے میں میری مہارت اور بے خوفی کا کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے۔'' (ص-۵۰)

مصنف اپنے ابتدائی اساتذہ میں سے ایک کی تنک مزاجی کا ذکر چھیڑتے ہوئے لکھتے ہیں:

''.....وہ مدرسے کے پڑھے ہوئے تھے اور بچوں کو پڑھانے لگے تھے لیکن بڑے چڑچڑے تھے۔ اس لیے مارتے زیادہ اور پڑھاتے کم تھے۔ ابا میری مرمت کی کہانیاں سن کر ان سنی کر دیتے۔ اس زمانے میں بچوں کی کھال کھینچنا استاد کا استحقاق تھا۔ کہاوت تھی کہ ماں باپ بچے کو استاد کے حوالے کرتے تو کہہ دیتے کہ اس کی ہڈی گڈی ہماری اور کھال آپ کی۔'' (ص-۶۲)

مصنف ایام طفلی میں گرمیوں کی چھٹیوں کا معمول بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''صبح فجر کے وقت ہم سب کو اٹھنا ہی پڑتا اس لیے کہ سارے بزرگ گھروں سے نکل کر مسجد کو جاتے ہوئے ہم لوگوں نام بہ نام پکارتے جاتے یہ ٹہوکے لگاتے جاتے۔ صبح کا کچھ وقت ادھر ادھر چہلوں میں گزارنے کے بعد ناشتے پر ٹوٹ پڑتے۔.....ناشتے کے بعد اگر بزرگوں نے کسی کام سے لگا دیا تو سے نپٹانا ہی پڑتا، اسی لیے حتی الوسع بزرگوں کی نظر سے بچنے کی کوشش کرتے۔'' (ص-۶۳)

مصنف عمر کے ایسے پڑاؤ پر ہیں، جہاں قلم پکڑنا تو دور لوگوں کے حواس مختل ہو جاتے ہیں، لبوں پر اختیار نہیں رہتا اور زبان بولنے سے کتراتے ہیں مگر انھوں نے ایسے حالات میں بھی نہ صرف کتاب تخلیق کی ہے، بلکہ اپنی شگفتہ تحریر سے جواں عمر قلمکاروں کو مہمیز دینے کا کام کیا ہے۔ ان کا یہ عمل ان کے تخلیقی کمال کا سراغ دیتا ہے۔ مصنف کی زبان بہت سادہ، سلیس اور شستہ ہے، وہ مختصر عبارت میں بہت کچھ کہہ دینے کا کمال رکھتے ہیں، وہ اپنے ایک پڑوسی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آزادی کے بعد ۱۹۴۸ء میں جب کوئریا پار میں ڈاک خانہ قائم ہوا تو ابا کے

مشورے پر للن بھائی پوسٹ ماسٹر مامور ہوئے۔انھوں نے ابتدائی اردو، فارسی اور قرآن تو پڑھ لیا تھا لیکن محکمہ ڈاک کی ذمہ داریوں کے اعتبار سے ان کی ایک بڑی کوالیفکیشن تھی وہ یہ کہ انھیں صرف ایک بار کسی طرح بنارس تک جانے کا اتفاق ہوا تھا اور اس طرح انھوں نے ریل گاڑی دیکھ لی تھی، گویا کہ وہ گاؤں کے قطب تھے جو کہ از جانی جنبد۔ دوسرے یہ کہ وہ پیسے پر خزانے کے سانپ کی طرح بیٹھ سکتے تھے۔ چنانچہ بقول شخصے ان کے دروازے پر نہ کبھی کسی نے ایک بتاشا کھایا نہ ایک بیڑا پان کا۔انھوں نے نہ کبھی کسی کا ختنہ، عقیقہ کرایا نہ اپنے علاوہ کسی کی شادی بیاہ کے چکر میں پڑے۔ان کی خوش قامتی کرتے پاجامے اور ایک عدد ٹوپی کے علاوہ کسی بار کی متحمل نہ ہوئی اور ان کی پاپوش پالش کے لیے زندگی بھر ایڑیاں رگڑتی رہ گئی۔'' (ص-۶۵)

موصوف اپنی ایام طفلی کی معصومانہ شرارتوں کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آموں کا نرخ تو یاد نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ بائیس گاہی یعنی ایک سو دس آم کا سیکڑہ مانا جاتا تھا (پانچ کی ایک گاہی ہوتی) چکھنے کی کوئی قیمت نہیں تھی، نہ اس میں کوئی روک ٹوک تھی، چنانچہ ہم بچے کبھی کبھی شرارتاً ایک طرف سے ایک ایک آم چکھتے اور منھ بسورتے چلے جاتے یعنی آم کھٹے ہیں۔'' (ص-۷۷)

بچپن کے ایام اور بھلا شرافت، دور دور تک کا کوئی رشتہ نہیں، کہا جاتا ہے کہ بچوں سے شیطان بھی پناہ مانگتا ہے، موصوف ایک جگہ اپنے بچپن کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہم لوگوں کو ایک ہفتہ وار پرچہ نکالنے کی سوجھی۔اس کا نام تجویز ہوا ''شیطان''، اس کی اشاعت کے لیے جمعہ کا دن مقرر کیا گیا..... جنگ کا زمانہ تھا، جرمنی اور برطانیہ کے نشریات نے ایک ذہنی فضا بنا دی تھی اس لیے 'ریڈیو جھوٹستان' کے حوالے سے خبروں کا ایک کالم رکھا گیا اور پروپیگنڈے کی ٹیکنک کے مطابق اس کالم کے اوپر لکھ دیتے 'لعنۃ اللہ علی الکاذبین'۔اس پرچے کی ایک ایک نقل جمعہ کی صبح کو ہر جماعت میں رکھ دی جاتی۔ایک دن ہماری شامت اعمال کہ پہلے ہی گھنٹے میں غیر متوقع طور پر مولوی ظفر الدین صاحب آ گئے، وہ ایک جید عالم تھے، سبز صافہ باندھتے اور ڈھیلی ڈھالی اچکن پہنا کرتے، انھوں نے میز پر

تازہ شمارہ دیکھا اور قرآن کی آیت کی بے حرمتی دیکھ کر آپے سے باہر ہو گئے۔ انھوں نے ہم دونوں کی ایسی مرمت کی کہ اخبار نکالنا بھول گئے، یوں آگے چل کر زندگی بھر اخبار ہی اوڑھنا بچھونا بنا رہا۔'' (ص-۸۲)

موصوف اپنی شوخیوں اور طفلانہ شرارتوں کو بڑی دلچسپی سے مزے لے کے بیان کرتے ہیں، انھوں نے اپنی زندگی کے بوسیدہ لمحات سے تازگی، طنز اور شوخی کشید کر کے اپنے قارئین کو شگفتگی اور سرور فراہم کرنے کی کامیاب کی ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''مولوی صاحب نے ہماری دوسری مرمت عزیز الدین کے ساتھ فرمائی۔ بات یوں ہوئی کہ ہیڈ ماسٹر لاری صاحب کا گھنٹہ ایک روز خالی تھا۔ ہم اور عزیز الدین دونوں بلیک بورڈ پر پہنچے اور ایک بیل گاڑی کا جیسا تیسا کارٹون بنایا اور اس کے نیچے لکھ دیا:

ان کی لاری عجیب لاری ہے
کوئی سمجھے کہ بیل گاڑی ہے

''ہماری شامت اعمال کہ مولوی صاحب کا گھنٹہ خالی تھا، وہی بھیج دیے گئے، بورڈ پر ان کی نظر پڑی تو اطمینان سے دریافت کیا کہ یہ کس کی کارستانی ہے۔ لڑکوں نے ہمیں نامزد کر دیا۔ آنا فانا مولانا کا چہرہ سرخ ہو گیا اور نہ معلوم کہاں سے ایک ٹوٹی ہوئی لکڑی ان کے ہاتھ لگ گئی، پھر تو انھوں نے اسی سے ہم لوگوں کی پیٹھ ٹھونک ٹھونک کر واقعی پھوڑ دی۔'' (ص-۸۳)

موصوف اپنے ٹرین کے سفر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس زمانے میں ٹرینوں میں سوار ہونا اور سفر کرنا جوئے شیر لانے سے کم دشوار نہ تھا، لیکن ایک آسانی ضرور تھی وہ یہ کہ ٹرین کی کھڑکیوں میں سلاخیں نہیں لگی ہوتی تھیں، اس لیے ان کھڑکیوں میں سے بھی ڈبوں میں گھسا جا سکتا تھا۔ میں دبلا پتلا تھا، اس لیے دروازے پر دھینگا مشتی کرنے کی بہ نسبت کھڑکی سے ڈبے میں گھسنا میرے لیے آسان تھا۔'' (ص-۱۱۰)

۱۹۴۶ء میں کولکاتہ میں ہوئے فسادات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سارے شہر میں زبردست کشت وخون، آتش زنی اور لوٹ مار جاری تھی لیکن تین دن تک پولیس کا کہیں پتہ نشان نہ تھا..... پہلے تین دنوں تک تو بالکل نراج کی کیفیت تھی..... سڑکوں پر لاشیں بکھری پڑی تھیں، کوئی ماتم گسار تو کیا ہوتا انھیں اٹھانے والا بھی کوئی نہ تھا.....کوئی ہفتہ بھر بعد سڑکوں پر پڑی لاشوں کی کیفیت ایسی نہ تھی کہ کوئی انھیں اٹھاتا، چنانچہ فوجیوں کی نگرانی میں مردہ جانور ڈھونے والی گاڑیاں لائی گئیں اور کرین سے اٹھا اٹھا کر لاشیں ان میں لادی گئیں، پھر ان کا جو بھی حشر ہوا ہوا..... جب فوج نے گھر گھر تلاشی شروع کی تو لوٹ کا مال لے جانے والوں نے سارا مال سڑکوں پر پھینکنا شروع کیا، اس طرح سڑکوں پر کپڑوں، فرنیچر وغیرہ کے ڈھیر لگ گئے، لوگ ان انباروں میں آگ لگا دیتے، عجب تباہی اور بربادی کا منظر تھا۔'' (ص-۱۱۴)

موصوف قیام بنارس کے دوران اپنی ریلوے کی ملازمت کی سخت کوشی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''صبح سات بجے سے شام سات بجے تک انجنوں کی جھاڑ پونچھ کرتا، کوئلہ توڑتا، کوئلہ جھونکتا، ہاتھ زخمی کبھی اس میں آبلے پڑے ہوئے۔ شام کو کالا کلوٹا، میلا کچیلا گھر واپس آتا، نہاتا دھوتا اور کوئی گوشہ اختیار کرتا۔ محنت سخت تھی اس لیے کھانا کھاتے ہی بے ہوش ہو جاتا۔'' (ص-۱۲۶)

بنارس میں تین سالہ قیام کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بنارس میں پہلا رمضان انجن میں کوئلہ توڑتے بھٹی جھونکتے گزرا تھا، دوسرا قدرے آرام سے گزرا اور تیسرے رمضان میں انٹر کا نتیجہ نکلا۔'' (ص-۱۴۴)

۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کے موقع پر اپنے حالات ومشاہدات کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو بنارس سے بھٹنی تک اسٹیشنوں کی سجاوٹ کے سامان جو ریلوے کی طرف سے فراہم کیے گئے تھے میں تقسیم کیے۔ ہم لوگوں نے اپنے انجن کو بھی سجانے کی کوشش کی تھی، کیلے کے پورے پورے درخت دونوں طرف باندھے گئے جو

بنارس سے بھٹنی تک کے سفر میں ہی سوکھ کر جھناٹا ہو گئے۔ ۱۴/اگست کو صبح دس بجے جو بھٹنی گیا تو رات کو دس بجے واپس آیا، بہت تھک گیا تھا، سو گیا۔ کب آزادی کا گھڑیال بجا نہیں معلوم۔ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو کی وہ تاریخی تقریر بھی نہیں سنی جو ۱۴/اگست اور ۱۵/اگست کی درمیانی نصف شب کو انھوں نے پارلیمنٹ ہاؤس کے ہال میں کی تھی۔ انھوں نے اس تقریر میں کہا کہ 'جب ساری دنیا سوتی ہے تو ہندوستان بیدار ہوتا ہے۔' آج سوچتا ہوں تو حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے، جو اس کے برعکس تھی..... سوچتا ہوں کہ سیاست کیسا طلسم سامری ہے جو صریح غلط کو بالکل صحیح ہونے کا یقین دلا دیتا ہے۔ کسی نے اس تاریخی غلط بیانی کی تردید نہیں کی۔'' (ص-۱۳۴)

غرض یہ کتاب نہ صرف رضوان اللہ صاحب کی آپ بیتی ہے بلکہ ان کے عہد کی اخلاقی، سماجی، سیاسی، ادبی، دینی اور ثقافتی حالات کا غماز بھی ہے، ضمنی طور پر اس میں ستمگر زمانے کے دوش پر لہرائے گئے دسیوں اہل کمال کا تذکرہ اور ان کے خاکوں کی جھلک بھی موجود ہے۔ اس کے مطالعہ سے ہمیں اپنے اسلاف کے طرز زندگی، سادگی، رواداری اور خلوص وللّٰہیت کا بھی بھرپور پتہ چلتا ہے۔

کتابیں تو بہت ہیں جو شائع ہو کر ضائع ہوتی رہتی ہے، مگر رضوان اللہ صاحب کی کتاب یقیناً ہمارے لیے ایک اہم علمی اثاثہ ہے، جس کے مطالعے کی خوشبو برسوں ذہن کو معطر کرتی رہے گی۔

خودنمائی اور خودستائی سے کوسوں دور رہنے والے رضوان اللہ صاحب کی شخصیت واقعی لاجواب ہے۔ وہ جہاں ایک بڑے تخلیق کار ہیں وہیں ایک عظیم انسان بھی ہیں۔ انکساری، شفقت اور چھوٹوں کا خیال ان کی نمایاں خصوصیات میں شامل ہیں۔ عمر میں میرے والد مرحوم سے بھی ایک دو سال بڑے ہیں، مگر اپنی کتابوں کو ہدیۃً عنایت کرتے ہوئے ناچیز کو 'برادرم' سے مخاطب کرنا، ان کی غایت کسر نفسی اور عظمت کی ہی غمازی کرتا ہے۔

عین کورونا کے مہلک وبا کے زمانے میں اتنی ضخیم کتاب تخلیق کر کے واقعتاً انھوں نے

بڑے بڑے قلمکاروں کو انگشت بدندان کردیا ہے۔ان کی حالیہ تصنیف نے یہ ثابت کردیا ہے کہ آندھیوں میں چراغ جلانا ہی درحقیقت اصل کمال ہے۔

سوانح، آپ بیتی اور خودنوشت کا عمل جہاں معدوم ہونے لگا ہے، وہیں اس کی ادبی حیثیت سے بھی لوگوں کی دلچسپیاں کم ہوتی جارہی ہیں۔ اس میں جہاں قارئین کی کوتاہ نظری شامل ہے، وہیں لکھنے والوں کی تحریری ثقل بھی ایک اہم وجہ رہی ہے۔''اوراق ہستی'' یقیناً اس صنف کو حیات نو بخشنے میں معاون ثابت ہوگی۔

تقریبا پانچ سو صفحات پر محیط''اوراق ہستی'' چار ابواب پر مشتمل ہے، ہر باب کو مصنف نے 'ورق' سے تعبیر کیا ہے۔ پہلا ورق ایام طفلی، خاندانی پس منظر، تعلیم وتربیت اور تلاش معاش کے ابتدائی حالات پر مشتمل ہے، 'دوسرا ورق' مصنف کی پیشہ ورانہ زندگی سے متعلق ہے اور 'تیسرا ورق' پیشہ ورانہ زندگی اور اس سے جڑے امور پر مشتمل ہے، جب کہ 'چوتھا ورق' سفر وسیاحت اور جہاں گردی سے جڑے مشاہدات وتجربات پر مشتمل ہے۔ زیرنظر مضمون میں صرف پہلے ورق سے کچھ باتیں ضبط تحریر کردی گئی ہیں، آئندہ کے اوراق اس سے کہیں زیادہ اہم ہیں جو لازمی طور پر کسی بھی ناول یا افسانے سے کم دلچسپ نہیں ہیں۔ خدا مصنف موصوف کے فیوض کو مزید وسعت بخشے۔

ڈاکٹر مغیث احمد
شعبہ فارسی، بی ایچ یو، وارانسی، یوپی
E-mail: moghees.ahmad5@gmail.com
Mob.: 9891567738

☆☆☆